تیز ھوا اور تنہا پھول

مُنیر نیازی

تیز ہوا اور تنہا پھول

منیر نیازی

گورا پبلشرز ○ ۲۵ لوئر مال لاہور

ناشر : طاہر اسلم گورا

گورا پبلشرز

۱۹۹۴

فی نسخہ : ۶۰ روپے

پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز ۲۵ لوئر مال، لاہور

خُدا کے نام

لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ
مِنَ الظّٰالِمِیْنَ

ترتیب

گیت

برسات

آہ! یہ بارانی رات
مینہ، ہوا، طوفان، رقصِ صاعقات
شش جہت پر تیرگی اُمڈی ہُوئی
ایک سنّاٹے میں گم ہے بزم گاہِ حادثات
آسماں پر بادلوں کے قافلے بڑھتے ہُوئے
اور مری کھڑکی کے نیچے کانپتے پیڑوں کے ہات
چار سُو آوارہ ہیں
بھُولے، بِسرے واقعات
جھگڑوں کے شور میں
جانے کتنی دُور سے
سُن رہا ہوں تیری بات

بازگشت

یہ صدا

یہ صدائے بازگشت

بیکراں وسعت کی آوارہ پری

سُست رَو جھیلوں کے پار

نم زدہ پیڑوں کے پھیلے بازوؤں کے آس پاس

ایک غم دیدہ پرند

گیت گاتا ہے مری ویران شاموں کے لیے

شبِ ویراں

یوکلپٹس کے پیڑ کے اوپر
ٹھٹھرے تاروں کے پھیلے جنگل میں
چاند تنہا اداس پھرتا ہے

یوکلپٹس کی سرد شاخوں سے
ٹھنڈے جھونکے لپٹ کے روتے ہیں

یوکلپٹس کے پیڑ کے نیچے
خشک پتے ہوا میں اڑتے ہیں

نیا موہ

تم بھی کہو —— تم سچی ہو!
تم بھی اِن کاجل سے سجی آنکھوں میں آنسو لے آؤ
تم بھی ان کومل ہونٹوں سے چاہت کے سنگیت سناؤ

ایسی رات میں، جب آکاش پہ گہرا، گھور اندھیرا ہے
دُور دُور کی آوازوں نے سُکھ کا جال بکھیرا ہے
تم بھی چھیڑ کے پریت کی باتیں، بھُولے بِسرے غم کو جگاؤ

تم سے کہوں میں، مجھ سے کہو تم
ساتھ نبھانے والی باتیں
دل کو لبھانے والی باتیں

تم سے کون کہے یہ چاہت رات کی رات ہے مٹ جائیگی
رات کی مہکی سیج کی خوشبو، دن آیا تو مٹ جائیگی

یوں ہی ہر من موہنی صُورت
دل میں جو بس جاتی ہے
رو رو کر سمجھاتی ہے
"میں سچّی ہُوں ــــــ"

غزل

ہیں آباد لاکھوں جہاں میرے دل میں
کبھی آؤ دامن کشاں میرے دل میں

اُترتی ہے دھیرے سے راتوں کی چپ میں
ترے رُوپ کی کہکشاں میرے دل میں

اُبھرتی ہیں راہوں سے کرنوں کی لہریں
سسکتی ہیں پرچھائیاں میرے دل میں

وہی نُور کی بارشیں کاخ و کُو پر
وہی جھٹپٹے کا سماں میرے دل میں

زمانے کے لب پر زمانے کی باتیں
مری دُکھ بھری داستاں میرے دل میں

کوئی کیا رہے گا جہانِ فنا میں
رہو تم رہو جاوداں میرے دل میں

رشتۂ خیال

کبھی کسی بام کے کنارے
اُگے ہُوئے پیڑ کے سہارے
مجھے ملی ہیں وہ مست آنکھیں
جو دل کے پاتال میں اُتر کر
گئے دنوں کی کپھا میں جھانکیں

کبھی کسی اجنبی نگر میں
کسی اکیلے، اُداس گھر میں
پری رُخوں کی حسین سبھا میں
کسی بہارِ گریز پا میں
کبھی سرِ رہ، کبھی سرِ کُو
کبھی پسِ در، کبھی لبِ جُو
مجھے ملی ہیں وہی نگاہیں
جو ایک لمحے کی دوستی میں
ہزار باتوں کو کہنا چاہیں

روشنی

تھکی تھکی گلوں کی بُو
بھٹک رہی ہے جُو بہ جُو

چھلک رہے ہیں چار سُو
لبوں کے رس بھرے سَبُو

ہوا چلی تو چل پڑیں
کہانیاں سی کُو بہ کُو

لبِ مہ و نجوم پر
رُکی رُکی سی گفتگو

یہ اِک خلائے دم بخود
یہ اِک جہانِ آرزو

گئے دنوں کی روشنی
کہاں ہے تُو، کہاں ہے تُو

آمدِ شب

دیے ابھی نہیں جلے
درخت بڑھتی تیرگی میں چھپ چلے
پرند قافلوں میں ڈھل کے اُڑ چلے
ہوا ہزار مرگِ آرزو کا ایک غم لیے
چلی پہاڑیوں کی سمت رُخ کیے
کھُلے سمندروں پہ کشتیوں کے بادباں کھلے
سَوادِ شہر کے کھنڈر
گئے دنوں کی خوشبوؤں سے بھر گئے
اکیلی خواب گاہ میں
کسی حسیں نگاہ میں
الم میں لپٹی چاہتیں ورودِ شب سے جاگ اُٹھیں
ہے دل کو بے کلی، سیاہ رات آئے گی
جلو میں دُکھ کی لاگ کو لیے ہوئے
نگر نگر پہ چھائے گی

حدیثِ دل

کبھی تو بن جائے گا سہارا
کسی افق کا کوئی ستارا
اسی تمنا میں مضطرب ہے
عجیب شے ہے یہ دل ہمارا

گزرتے جھونکوں کے کارواں نے
یونہی کوئی راگنی سنا دی
تو اس کے خوابوں میں جاگ اُٹھتی
ہے خوب صورت سی شاہزادی

بہار کی رُت میں جب ہوائیں
سُلگتی خوشبو اڑا کے لائیں
تو اس کے ہر سمت شور کرتی
ہیں بیتے لمحوں کی اپسرائیں

جہاں کہیں ایک پل کسی نے
اسے کبھی پیار سے بُلایا
یہ ایسا مورکھ ہے جان لے گا
بس اب خوشی کا زمانہ آیا

منڈیریں چُپ ہیں ستارے جھلمل
ہوا میں گم ہے وہ ماہِ کامل
سُنا ہوا کو، فسانے غم کے
ارے مرے دل، ارے مرے دل

خزاں

ہوا کی آواز

خشک پتّوں کی سرسراہٹ سے بھر گئی ہے
روش روش پر فتادہ پھولوں نے
لاکھوں نوحے جگا دیے ہیں
سلیٹی شامیں، بلند پیڑوں پہ غل مچاتے
سیاہ کوّوں کے قافلوں سے اَٹی ہُوئی ہیں
ہر ایک جانب خزاں کے قاصد لپک رہے ہیں
ہر ایک جانب خزاں کی آواز گونجتی ہے
ہر ایک بستی کشاکشِ مرگ و زندگی سے نڈھال ہو کر
مسافروں کو پکارتی ہے کہ ــــ "آؤ
مجھ کو، خزاں کے بے مہر، تلخ احساس سے بچاؤ"

ایک لڑکی

ذرا اس خود اپنے ہی
جذبوں سے مجبور لڑکی کو دیکھو
جو اک شاخِ گل کی طرح
اَن گنت چاہتوں کے جھکولوں کی زد میں
اُڑی جا رہی ہے
یہ لڑکی
جو اپنے ہی پھول ایسے کپڑوں سے شرماتی
آنچل سمیٹے، نگاہیں جھکائے چلی جا رہی ہے
جب اپنے حسیں گھر کی دہلیز پر جا رُکے گی
تو مُنھ موڑ کر مسکرائے گی جیسے
ابھی اس نے اک گھات میں بیٹھے
دل کو پسند آنے والے
شکاری کو دھوکا دیا ہے

غم

یہ سب چاند، تارے
بہاریں، خزائیں، بدلتے ہوئے موسموں کے ترانے
ترا حُسن، میری نم آلود آنکھیں
تصوّر کے ایواں، نگاہوں کی کلیاں، لبوں کے فسانے
یہ سب میرے سانسوں کی جادوگری ہے
مگر پھر بھی مجھ کو یہ غم ہے کہ جب میں مروں گا
یہ سب چاند، تارے
بہاریں، خزائیں
بدلتے ہوئے موسموں کے ترانے
ترا حُسن، دنیا کے رنگیں فسانے
یہ سب مل کے زندہ رہیں گے
فقط اک مری اشک آلود آنکھیں نہ ہوں گی ...!

من مُورکھ

دل کہتا ہے، اِس دنیا میں
کوئی تو ایسی نار ملے
جس کے روپ کو جو بھی دیکھے
اس کے من کا کنول کھلے
سب جگ چھوڑ کے وُہ ، بس ہم سے
پریم کی بات نبھائے
جب بھی ہم پردیس سدھاریں
رو رو نین گنوائے
وہ ہم کو اس امر پریم کے
لاکھوں گیت سُنائے

جس کی کھوج میں دنیا والے
گھاٹ گھاٹ کا بِس پی آئے
انجانے دیسوں میں پھرتے
دھیان میں ایسی گوری آئے
جو سکھیوں سے دُور، اکیلی
اپنی یاد میں جلتی جائے

پت جھڑ

وہ دن بھی آنے والا ہے

جب تیری ان کالی آنکھوں میں ہر جذبہ مٹ جائے گا

تیرے بال، جنھیں دیکھیں — تو

ساون کی گھنگھور گھٹائیں، آنکھوں میں لہراتی آئیں

ہونٹ رسیلے

دھیان میں لاکھوں پھولوں کی مہکار جگائیں

وہ دن دُور نہیں جب ان پر

پت جھڑ کی رُت چھا جائے گی

اور اُس پت جھڑ کے موسم کی

کسی اکیلی شام کی چُپ میں؟

گئے دنوں کی یاد آئے گی

جیسے کوئی کسی جنگل میں گیت سہانے گاتا ہے

تجھ کو پاس بلاتا ہے ———

سراپا

اس کی آنکھیں کالے بھنوروں کی حزیں گنجار ہیں
ہونٹ اس کے عطر میں بھیگے ہوئے یاقوت کی مہکار ہیں
اس کی گردن جیسے مینائے شراب
اس کے نازک ہاتھ جیسے باغ میں رنگیں گلاب
بال اس کے کالی مخمل کا حسیں انبار ہیں
دانت جیسے موتیئے کا خوب صورت ہار ہیں
یہ بھنویں ہیں یا گھٹائیں جھوم کر آئی ہوئیں؟
اور پلکیں کوہِ غم کو چوم کر آئی ہوئیں؟
پیٹ — مرمر کی تراشیدہ چٹان
ناف — سکھ کے نشے میں سویا مکان
ساق — پورے چاند کی پہلی سنہری تان ہے
سینہ — شیریں شہد میں ڈوبا ہوا پیکان ہے

اس کی ریشم سی کمر کھاتی ہے بل وقتِ خرام
اس کے کوٹھے دیکھنے والی نگاہوں کے لیے ہیں تنگ دام
اس کی رنگت شرم سے گلنار ہے
اس کا ہر جذبہ ہوا تے عشق سے سرشار ہے

غزل

اشکِ رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو
اُس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

لائی ہے اب اڑا کے گئے موسموں کی باس
برکھا کی رُت کا قہر ہے اور ہم ہیں دوستو

دل کو ہجومِ نکہتِ مہ سے لہو کیے
راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو

پھرتے ہیں مثلِ موجِ ہوا شہر شہر میں
آوارگی کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو

آنکھوں میں اُڑ رہی ہے لُٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

برہا کا گیت

بچھڑ کے جانے والے لوگو
جب بھی رات کو بادل برسے
ہم کو دھیان میں لا کر اتنا رو ؤ کہ آنکھوں کا کاجل
بہہ کر سُندر گال بھگو دے

بچھڑ کے جانے والے لوگو
جب بھی رات کو بجلی چمکے
چاہت کے سنگیت سُنا کر ہمیں بُلاؤ
ہم بھی ہوا کے جھونکوں میں
ہر اُجڑے نگر میں جاتے ہیں
اور گیت پرانے گاتے ہیں

ملن کی رات

اے دوشیزہ! مت گھبرا
اب سورج ڈوبنے والا ہے
سورج ڈوب کے ایک اندھیری کالی رات کو لائے گا
لاکھوں اَن ہونی باتوں کا میلہ دھیان میں لائے گا
پھر بادل گھِر گھِر آئیں گے
گرج گرج کر، چمک چمک کر تیرا جی دہلائیں گے
برکھا کے اُس سناٹے میں، مکٹ سجائے
اک متوالا آئے گا
ساتھ تجھے لے جائے گا

پریم کہانی

دُور کہیں اک مدھوبن ہے
اُس بن کا ہر پیڑ ہرا ہے
اُس بن میں اک موہ بھرا ہے

اُس میں کوئلیں رہتی ہیں
دن کو سُکھ کی تان اڑا کر
رات کو وُہ دُکھ سہتی ہیں

اُس بن میں اک بھولی رادھا
شیام سے ملنے آتی تھی
جب اس کو نہیں پاتی تھی
تو رو رو نین گنواتی تھی

پریم کی اِس متوالی کتھا کو

کئی زمانے بیت گئے ہیں

اُس یُگ کی ہر تان مٹی ہے

اس یُگ کے سب گیت گئے ہیں

وہ مدھوبن اب تک ویسا ہے

اُس بن کا ہر پیڑ ہرا ہے

اُس بن میں ایک موہ بھرا ہے

رات کی اذیّت

رات بے حد چُپ ہے اور اس کا اندھیرا شر نگیں
شام پڑتے ہی دمکتے تھے جو رنگوں کے نگیں
دُور تک بھی اب کہیں ان کا نشاں ملتا نہیں

اب تو بڑھتا آئے گا گھنگھور بادل چاہ کا
اس میں بہتی آئے گی اک مدھ بھری میٹھی صدا
دل کے سُونے شہر میں گونجے گا نغمہ چاہ کا

رات کے پردے میں چُھپ کر خوں رُلاتی چاہتو
اس قدر کیوں دُور ہو مجھ سے ذرا یہ تو کہو
میرے پاس آ کر کبھی میری کہانی بھی سُنو

سسکیاں لیتی ہوائیں کہہ رہی ہیں "چُپ رہو"

میرا سین

یوں تو اس من موہنے دیس کی ہر بالا مدھو بالا ہے
اس کے ہر اک انگ میں میٹھی کامناؤں کا بھالا ہے
اس کے مکھ کا جو بھی بول ہے جادو کرنے والا ہے

پر اک کنیا ایسی ہے جو روپ میں سب سے نیاری ہے
اس کی ہر چھب چاہنے والے دل میں دکھ کی کیاری ہے

وہ چھپ چھپ کر دُور دُور سے آنکھوں میں مسکاتی ہے
ہونٹوں کی پیاس بڑھاتی ہے اور دل میں اندھیرا لاتی ہے

غزل

اُن سے نین ملا کے دیکھو
یہ دھوکا بھی کھا کے دیکھو

دُوری میں کیا بھید چھپا ہے
اس کا کھوج لگا کے دیکھو

کسی اکیلی شام کی چپ میں
گیت پرانے گا کے دیکھو

آج کی رات بہت کالی ہے
سوچ کے دیپ جلا کے دیکھو

دل کا گھر سنسان پڑا ہے
دکھ کی دھوم مچا کے دیکھو

جاگ جاگ کر عمر کٹی ہے
نیند کے دوارے جا کے دیکھو

لیلیٰ

رات کی اونچی فصیلوں پر دمکتے، لال ہونٹوں والی کالی حبشنیں خنجر بکف
اور فصیلوں سے گھرے جادو بھرے شہروں کی دھندلی روشنی میں ہر طرف
دائروں میں گیت گاتی دلہنوں کے مرمریں ہاتھوں میں بجتے زرد دف

شش جہت کی تیرگی میں دم بدم بڑھنے لگی ہے مور پنکھوں کی صدا
چھا رہا ہے کھڑکیوں پر سرنگوں، پھولوں بھری بیلوں کا رنگیں سلسلا؟
لگ رہا ہے سرخ ریشم سے سجے کمروں میں شرمیلی نگاہوں کا رسیلا جمگھٹا؟

کس حسیں، خاموش گلشن میں کھلا ہے میری چاہت کا دمکتی پنکھڑیوں والا گلاب
کون سے جادو بھرے کوچے میں بہتی ہے اُن آنکھوں کی خمار آگیں شراب
کب فصیلِ شب کے اک پوشیدہ دروازے سے جھانکے گا وہ چمکیلا سراب
بول، اے بادِ شبانہ کے نرالے نقش دکھلاتے ہوئے گونگے رباب

طلسمات

پرے سے دیکھو تو صرف خوشبو قریب جاؤ تو اک نگر ہے

طلسمی رنگوں سے بھیگتے گھر لبنائی سانسوں سے بند گلیاں
خموش محلوں میں خوب صورت طلائی شکلوں کی رنگ رلیاں
کسی دریچے کی چق کے پیچھے دہکتے ہونٹوں کی سرخ کلیاں
پرے سے تکتی ہر اک نظر اس نگر کی راہوں سے بے خبر ہے

حنائی انگشت کا اشارہ لجائی آنکھوں کی مسکراہٹ
کبھی یونہی راہ چلتے اک ریشمی دوپٹے کی سرسراہٹ
سیاہ راتوں کو ہولے ہولے قریب آتی ہوئی سی آہٹ
یہ ساری راہیں ہیں اُس نگر کی جو دائمی آنسوؤں کا گھر ہے

آتما کا روگ

شراپ دے کے جا چکے ہیں سخت دل مہاتما
سمے کی قید گاہ میں بھٹک رہی ہے آتما

کہیں سلونے شیام ہیں نہ گوپیوں کا پھاگ ہے
نہ پائلوں کا شور ہے نہ بانسری کا راگ ہے
بس اک اکیلی رادھیکا ہے اور دُکھ کی آگ ہے

ڈراؤنی صداؤں سے بھری ہیں رات کی گپھائیں
اُداس ہو کے سُن رہی ہیں دیوتاؤں کی کتھائیں
بہت پُرانے مندروں میں رہنے والی اپسرائیں
ہوئیں ہوائیں تیز تر بڑھی بنوں کی سائیں سائیں

دُوری

دُور ہی دُور رہی بس مجھ سے
پاس وہ میرے آ نہ سکی تھی
لیکن اس کو چاہ تھی میری
وہ یہ بھید چھُپا نہ سکی تھی

اب وہ کہاں ہے اور کیسی ہے
یہ تو کوئی بتا نہ سکے گا
پر کوئی اس کی نظروں کو
میرے دل سے مٹا نہ سکے گا

اب وہ خواب میں دلہن بن کر
میرے پاس چلی آتی ہے
میں اس کو تکتا رہتا ہوں
لیکن وہ روتی جاتی ہے

موت

ہر طرف خاموش گلیاں زرد رُو گونگے مکیں
اُجڑے اُجڑے بام و در اور سُونے سُونے شہ نشیں
ممٹیوں پر ایک گہری خامشی سایہ فگن
رینگ کر چلتی ہوا کی بھی صدا آتی نہیں

اس سکوتِ غم فزا میں اک طلسمی نازنیں
سُرخ گہرے سُرخ لب اور چاند سی پیلی جبیں
آنکھ کے مبہم اشارے سے بلاتی ہے مجھے
ایک پُر اسرار عشرت کا خزانہ ہے وہ چشمِ دل نشیں

حقیقت

نہ تو حقیقت ہے اور نہ میں ہوں
نہ تیری مری وفا کے قصّے
نہ برکھا رُت کی سیاہ راتوں میں
راستہ بھُول کر بھٹکتی ہوئی سجل ناریوں کے جھرمٹ
نہ اُجڑے نگروں میں خاک اُڑاتے
فسردہ دل بریمیوں کے نوحے
اگر حقیقت ہے کچھ تو یہ اک ہوا کا جھونکا
جو ابتدا سے سفر میں ہے
اور جو انتہا تک سفر کرے گا

غزل

اس ملگجے سے بھری شب میں بجلی جو کڑک جائے
اس شوخ کا ننھا سا دل ڈر سے دھڑک جائے

اس سمت چلو تم بھی اے بھٹکے ہوئے لوگو
جس سمت یہ ویراں سی چپ چاپ سڑک جائے

یہ ڈوبتا سورج اور اس کی لبِ بام آمد
تا حدِّ نظر اُس کے آنچل کی بھڑک جائے

گلشن کی خموشی تو اب جی کو ڈراتی ہے
کوئی بھی ہوا جس سے پتّہ ہی کھڑک جائے!

مدّت سے جو روٹھے ہیں اور مجھ سے نہیں ملتے
گر شعر مرے سُن لیں جی اُن کا پھڑک جائے

کون

کوئی شام کے وقت

نظروں کی حد پر کھڑے سبز جنگل میں جاتے

تو اس کو ہوائیں

غموں کی حکایت سے لبریز اک تان سننے میں آئے

کسی رات کی نیلی چُپ میں

اگر میں کبھی اُن گلوں سے لدی چوٹیوں پہ کھڑا ہو کے

تاروں کو چھُونے کی کوشش کروں تو

کوئی رو کے کہتا ہے ”یہ مت کرو“

کہو کون ہے یہ، جو چھُپ کر

سرِ رہگزر اُڑنے والے حسین آنچلوں کے مدھر راگ میں

ایک جاں لیوا دُکھ کی جلن گھولتا ہے

کہو کون ہے؟
جس نے ہر سبز جنگل میں چلتی ہواؤں
گلوں سے لدی چوٹیوں پر چمکتے ستاروں
کو دُکھ کی امرتان سے بھر دیا ہے
کہو کون ہے؟

اشارے

شہر کے مکانوں کے
سرد سائبانوں کے
دلربا، تھکے سائے
خواہشوں سے گھبرائے
رہرووں سے کہتے ہیں
رات کتنی ویراں ہے
موت بال افشاں ہے
اس گھنے اندھیرے میں
خواہشوں کے ڈیرے ہیں
دل کے چور بستے ہیں
ان کے پاس جانے کے
لاکھ چور رستے ہیں

کال

رِم جھم رِم جھم بادل برسے بجلی شور مچائے
اُجڑے ہوتے نگروں میں بسنے والے دھندلے سائے
کالی رات کا روپ دھار کر مجھے ڈرانے آئے

دل دہلانے والی آوازوں کا جادو جاگا
پاگل جھونکوں کے ڈر سے ہر گھر کا اُجالا بھاگا
دُکھ کے بوجھ سے ٹوٹ رہا ہے موہ کا کچّا دھاگا

ایک ہی جلتی سوچ کی اگنی ہردے کو کلپائے
کیا ہو، جو اس کالی رات کی بھور کبھی نہ آئے
گلی گلی کے دیپ بجھاتی برکھا بڑھتی آئے

غزل

یہ لڑکی جو اس وقت سرِ بام کھڑی ہے
اُڑتا ہوا بادل ہے کہ پھُولوں کی لڑی ہے

شرماتے ہُوئے بندِ قبا کھولے ہیں اس نے
یہ شب کے اندھیروں کے مہکنے کی گھڑی ہے

اک پیرہن سُرخ کا جلوہ ہے نظر میں
اک شکل نگینے کی طرح دل میں جڑی ہے

کِھلتا تھا کبھی جس میں تمنّا کا شگوفہ
کھڑکی وہ بڑی دیر سے ویران پڑی ہے

طاؤس کی آواز سے روشن ہے شبِ تار
صد نغمۂ ناہید یہ ساون کی جھڑی ہے

زنداں

شام ہوتے ہی شرابِ عشق پی کر جھومتی شہزادیاں
دُوریوں پر مسکراتی نازنینوں کی حسیں آبادیاں
خواہشوں کی آگ میں دن رات جلتے گلبدن
اطلس و زربفت کے محلوں کی تنہائی میں روتے سیم تن

شرم کی خوشبو سے جھکتی جا رہی معصوم چنچل لڑکیاں
اپنی محبوباؤں کے گلریز پہلو میں بہکتے نوجواں
اُجڑے شہروں کے مکانوں کے اکیلے نوحہ خواں
اپنے اپنے دائرے میں ہر کوئی بے چین ہے
گردبادِ یاس و غم میں گم ہے یہ کون و مکاں

خلش

وہ خوب صورت لڑکیاں

دشتِ وفا کی ہرنیاں

شہرِ شبِ مہتاب کی

بے چین جادو گرنیاں

جو بادلوں میں کھو گئیں

نظروں سے اوجھل ہو گئیں

اب سرد، کالی رات کو

آنکھوں میں گہرا غم لیے

اشکوں کی بہتی نہر میں

گلنار چہرے نم کیے

ہنسی کی سرحد سے پرے

خوابوں کی سنگیں اوٹ سے

کہتی ہیں مجھ کو "بے وفا!

ہم سے بچھڑ کر کیا تجھے

سکھ کا خزانہ مل گیا؟"

آخری عمر کی باتیں

وہ میری آنکھوں پر جُھک کر کہتی ہے "مَیں ہوں"
اس کا سانس مرے ہونٹوں کو چھو کر کہتا ہے "مَیں ہوں"
سُونی دیواروں کی خموشی سرگوشی میں کہتی ہے "مَیں ہوں"
"ہم گھایل ہیں" سب کہتے ہیں
میں بھی کہتا ہوں — "مَیں ہوں"

شبخوں

جب بن سیاہ رات کے تاروں سے بھر گئے
گنجِ چمن میں چمکے شگوفے نئے نئے
مجھ کو ہوا نے بات سجھائی عجیب سی
بادل میں ایک شکل دکھائی عجیب سی
چاند آسماں کی سیج پہ سویا ہُوا مِلا
رنگِ گُلِ انار میں لتھڑا ہُوا مِلا
اے عاشقانِ حسنِ ازل! غور سے سنو
یہ داستانِ جنگ و جدل غور سے سنو
میں برگِ بے نوا تو نہیں ہوں کہ چُپ رہوں
دل کے کسی بھی شعلے کو عُریاں نہ کر سکوں
میں تیغ ہاتھ میں لیے سُوئے فلک گیا
جذبوں کے رس سے مہکے ہوئے چاند تک گیا
کافی تھا ایک وار مری تیغِ تیز کا
مہتاب کے بدن سے لہو پھُوٹ کر بہا

پاگل پن

اِک پردہ کالی مخمل کا آنکھوں پہ چھانے لگتا ہے
اِک بھنور ہزاروں شکلوں کا دل کو دہلانے لگتا ہے
اک تیز حنائی خوشبو سے ہر سانس چمکنے لگتا ہے
اک پھول طلسمی رنگوں کا گلیوں میں دمکنے لگتا ہے
سانپوں سے بھرے اک جنگل کی آواز سنائی دیتی ہے
ہر اینٹ مکانوں کے چھجّوں کی خون دکھائی دیتی ہے

بے بسی

پھلجھڑی سسکی کی گہری رات میں چھوٹی نہیں
جوئے خوں کوہِ سیہ کی آنکھ سے پھوٹی نہیں
خیمۂ غم کی طنابِ ریشمیں ٹوٹی نہیں
تیرگی کے راہ زن نے دختِ زر لوٹی نہیں

کشتئ دل بحرِ غم کی موج میں کھیتے رہو
اپنے ہی خوں کے چراغاں کے مزے لیتے رہو
عمر بھر شب کے اندھیرے کو صدا دیتے رہو

جادُو کا کھیل

رنگ برنگے شیشوں والی کھڑکی بند پڑی ہے اب
وہ لڑکی جو اس میں کھڑی لوگوں کو خواب دکھاتی تھی
کالی کالی راتوں میں ہونٹوں کی شمع جلاتی تھی
تیز نگاہوں کی بجلی سے سب کے ہوش اُڑاتی تھی
دستِ حنائی کے شعلے سے چق میں آگ لگاتی تھی
اب وہ دلوں سے کھیلنے والی لڑکی تو ہے بیاہی گئی
سنتے ہیں وہ لڑکی جاتے وقت بہت ہی روئی تھی
یوں لگتا تھا اُس کی کوئی قیمتی سی شے کھوئی تھی

غزل

وہ جو میرے پاس سے ہو کر کسی کے گھر گیا
ریشمی ملبوس کی خوشبو سے جادو کر گیا

اک جھلک دیکھی تھی اُس رخِ دلآرا کی کبھی
پھر نہ آنکھوں سے وہ ایسا دلربا منظر گیا

شہر کی گلیوں میں گہری تیرگی گریاں رہی
رات بادل اس طرح آئے کہ میں تو ڈر گیا

تھی وطن میں منتظر جس کی کوئی چشمِ حسیں
وہ مسافر جانے کس صحرا میں جل کر مر گیا

صبحِ کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیرؔ
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

ایک رسم

شہر کے گھر سنسان پڑے ہیں
سارے لوگ گھروں سے باہر
چاند کی پوجا کرنے گئے ہیں

وہ ویراں باغوں میں جا کر
چاند نکلتا دیکھتے ہیں
جب مشرق پر روشنی کا
اک تیز نشان دمکتا ہے
وہ سرگوشی کے لہجے میں
کچھ منتر پڑھنے لگتے ہیں

رات گئے تک اسی طرح وہ
چاند کو جلتا دیکھتے ہیں
دُوری کے ریگستانوں میں
لہُو اگلتا دیکھتے ہیں

بے وفائی

رنگ کی رسل کو اُٹھا کر
دُور تک جانا بہت دشوار ہے
ہر در و دیوار سے مِل کر جدُا ہوتی ہوا سے
دیر تک نظریں ملانا بھی بہت دشوار ہے
آنکھ کے آنسو کو
ہیرے کی طرح دل میں چھپانا بھی بہت دشوار ہے
دوریوں پر بیٹھ کر ہنستی ہیں سُکھ کی دُلہنیں
شرم کے فانوس سے جگمگ ہیں شہروں کے مکاں
جذبۂ شب کی کلیدِ احمریں
کھولتی ہے عشرتوں کے سیل کا قفلِ گراں
رینگتے چلتے ہیں دشتِ شوق میں
حسن کے جادو میں ڈوبے محملوں کے کارواں

لاکھ کوئی دوریوں پر بیٹھ کر روتا رہے
رنگ کی سِل کو اُٹھا کر
دُور تک جانا بہت دشوار تھا
ہر در و دیوار سے مل کر جُدا ہوتی ہوا سے
دیر تک نظریں ملانا بھی بہت دشوار تھا

دُور کے نگر

دُور کے نگروں میں جانے کا دل کو شوق بڑا ہے

اُن میں سکھ سے بھرے آنگن ہیں، ٹھنڈی تیز ہَوا ہے
رنگ برنگی کامِنیوں کے رُوپ کا دیپ جلا ہے
گلیوں میں کاجل سے سجی آنکھوں کا میلہ لگا ہے

ان نگروں کی کھوج میں پھرتے جیون انت ہُوا ہے

شراپ

جب رات کا پہلا گجر بجے
تب اس گوری کی سیج سجے
آشا کا مہکتا پھول کھلے
بچھڑا ہُوا پریمی آن ملے
میٹھی باتوں کی دھوم مچے
جلتے سانسوں کی راس رچے
پھر کام کا زہری بان چلے
گوری رو رو کر ہاتھ ملے

کلپنا

رات ہے کتنی گہری کالی
دُکھ کی بات سُجھانے والی
دُور دُور کی آوازوں کو
اُجڑے گھروں میں لانے والی

سر پہ ہے گھنگور بدریا
دل میں لگن پریتم کے ملن کی
شور مچاتی بڑھتی آئے
تیز ہوا سونے مدھوبن کی

چڑھتا ساگر رستہ روکے
بیرن بجلی جی کو ڈرائے
دُور بہت ہے پی کی نگریا
ہم سے تو اب چلا نہ جائے

غزل

بیگانگی کا ابرِ گراں بار کھُل گیا
شب مَیں نے اس کو چھیڑا تو وہ یار کھُل گیا

گلیوں میں شام ہوتے ہی نکلے حسین لوگ
ہر رہگزر پہ طبلۂ عطّار کھُل گیا

ہم نے چھپایا لاکھ مگر چھُپ نہیں سکا
انجامِ کار رازِ دلِ زار کھُل گیا

تھا عشرتِ شبانہ کی سرمستیوں میں بند
بادِ سحر سے دیدۂ گلبار کھل گیا

آیا وہ بام پر تو کچھ ایسا لگا منیرؔ
جیسے فلک پہ رنگ کا بازار کھُل گیا

میں

میں بھی دل کے بہلانے کو کیا کیا سوانگ رچاتا ہوں
سایوں کے جھرمٹ میں بیٹھا سُکھ کی سیج سجاتا ہوں
بجھتے جلتے دیپک سے سپنوں کے چاند بناتا ہوں
آپ ہی کالی آنکھیں بن کر اپنے سامنے آتا ہوں
آپ ہی دکھ کا بھیس بدل کر ان کو ڈھونڈنے جاتا ہوں

مَیں اور بادل

شام کا بادل نئے نئے انداز دکھایا کرتا ہے
کبھی وہ ننھا بچّہ بن کر میرے سامنے آتا ہے
کبھی وُہ اپنا خون بہا کر میرے جی کو ڈراتا ہے
کبھی کسی ہنس مُکھ عورت کی طرح مجھے بہلاتا ہے
پھر آنکھوں سے اشارہ کر کے کمرے میں چھُپ جاتا ہے
اسی طرح وہ نئے نئے انداز دکھایا کرتا ہے
جب کوئی اس کو گھور کے دیکھے ناز دکھایا کرتا ہے

ابھیمان

میرے سوا اس سارے جگ میں کوئی نہیں دل والا
میں ہی وہ ہوں جس کی چِتا سے گھر گھر ہُوا اُجالا
میرے ہی ہونٹوں سے لگا ہے نیلے زہر کا پیالا
میری طرح کوئی اپنے لہو سے ہولی کھیل کے دیکھے
کالے کٹھن پہاڑ دکھوں کے سر پہ جھیل کے دیکھے

اُپدیش

جگمگ جگمگ کرتی آنکھیں ہیرے جیسے گال
جادو ہے ہونٹوں میں اس کے بجلی جیسی چال
اسکی حنائی مٹھی میں ہے عطر بھرا رومال
جس کی مہک سے شہر بنا ہے خوشبوؤں کا جال

جو اس سارے جگ میں نہیں ہے اس کی چاہ میں مرنا
یہ تو پاگل پن ہے لوگو، ایسا کبھی نہ کرنا

شیش محل

کس سے ملوں اور کس سے بچھڑوں اس جادو کے میلے میں
آنکھیں اور دل دونوں مل کر پڑ گئے عجب جھمیلے میں

سب کی آنکھیں سجی ہوئی ہیں ارمانوں کے پھولوں سے
سب کے دل گھبرائے ہوئے ہیں چاہ کے تند بگولوں سے

حیرت کی تصویر بنا ہوں رنگ برنگے چہروں میں
ایسا جو مجھ کو بہلائے، کوئی نہیں بے مہروں میں

تنہائی

میں، نگہت اور سُونا گھر
تیز ہوائیں بجتے در
لمبے صحن کے آخر پر
لال گلاب کا تنہا پھُول

اب مَیں اور یہ سُونا گھر
تیز ہوائیں بجتے در
دیواروں پر گہرا غم
کرتی ہے آنکھوں کو نم
گئے دِنوں کی اُڑتی دھول

چور دروازے

نگہت کی آنکھوں میں گہرے رازوں کی کچھ باتیں ہیں
سات سمندر پار کے شہروں کی کالی برساتیں ہیں
دیواروں سے لپٹ لپٹ کر رونے والی راتیں ہیں

نگہت کے بکھرے بالوں میں سکھ کا خزانہ ملتا ہے
دل کو عجب خیالوں میں رہنے کا بہانہ ملتا ہے
ایک گلابی پھول مہک کے طوفانوں میں کھلتا ہے
کسی پرانی خواب گاہ کا ریشمی پردہ ہلتا ہے

غزل

رات یوں تو جو ادا تیری تھی محبوبانہ تھی
پھر بھی کیا شے اک تری وہ چشمکِ بیگانہ تھی

جب سفر سے لوٹ کر آئے تو کتنا دکھ ہوا
اُس پرانے بام پر وہ صورتِ زیبا نہ تھی

کیا فراقِ یار کے قصّے پہ آنکھیں نم کریں
دل سے شعلے کا مقدر صحبتِ دریا نہ تھی

وہ کسی کی تیز نظریں تھیں اور اپنا ہی لہو
گرمیٔ محفل کا باعث تندیٔ صہبا نہ تھی

کیسے اپنے حال کی ان کو خبر ہوتی منیرؔ
خامشی دیوار و در کی کچھ لبِ گویا نہ تھی

میں، وہ اور رات

کمرے میں خاموشی ہے اور باہر رات بہت کالی ہے
اُونچے اونچے پیڑوں پر سیاہی نے چھاؤنی ڈالی ہے
تیز ہوا کہتی ہے پل میں برکھا آنے والی ہے

وہ سولہ سنگار کیے اپنی ہی سوچ میں کھوئی ہوئی ہے
سانسوں میں وہ گہرا پن ہے جیسے بے سدھ سوئی ہوئی ہے
دل میں سو ارمان ہیں لیکن میری سمت نگاہ نہیں ہے
یوں بیٹھی ہے جیسے اس کے دل میں کسی کی چاہ نہیں ہے

دُکھ کی بات

بچھڑ گئے تو پھر بھی ملیں گے ہم دونوں اک بار
یا اس بستی دنیا میں یا اس کی حدوں سے پار
لیکن غم ہے تو بس اتنا جب ہم وہاں ملیں گے
ایک دوسرے کو ہم کیسے تب پہچان سکیں گے
یہی سوچتے اپنی جگہ پر چپ چپ کھڑے رہیں گے
اس سے پہلے بھی ہم دونوں کہیں ضرور ملے تھے
یہ پہچان کے نئے شگوفے پہلے کہاں کھلے تھے
یا اس بستی دنیا میں یا اس کی حدوں سے پار
بچھڑ گئے ہیں مل کر دونوں پہلے بھی اک بار

صدا بصحرا

چاروں سمت اندھیرا گھپ ہے اور گھٹا گھنگھور

وُہ کہتی ہے "کون ——؟"

میں کہتا ہوں "میں ——"

کھولو یہ بھاری دروازہ

مجھ کو اندر آنے دو ——"

اس کے بعد اک لمبی چُپ اور تیز ہوا کا شور

خواب گاہ

سامنے ہے اک تماشائے بہارِ جانستاں
جا بجا بکھری ہوئی خوشبو کی خالی شیشیاں
نیم وا ہونٹوں پہ سُرخی کے بہت مدھم نشاں
ریشمی تکیے میں پیوست اس کی رنگیں انگلیاں

دیکھ اے دل، شوق سے یہ آرزو کا کارواں
رنگ و بُو کے سلسلے، لعل و گہر کی وادیاں
پھر نہ جانے تو کہاں اور یہ حسیں منظر کہاں

خوشی کا گیت

بیت گیا طوفان پریت کا
بیت گیا طوفان
ساری رات کٹھن تھی کتنی جیسے جلے پہاڑ
درد کا بادل گرجا جیسے بندوقوں کی باڑ
بجلی بن کر کڑک رہے تھے چاہت کے ارمان
بیت گیا طوفان
ختم ہوا وہ ارمانوں کے پاگل پن کا زور
مدھم ہو کر مٹا سا لگتی تیز ہوا کا شور
دہک دہک کر بجھ گیا آخر یہ دل کا شمشان
بیت گیا طوفان

ایک رات کی بات

باہر بارش برس برس کر
میٹھے گیت سناتی ہے
اور کمرے کے اندر نکہت
مجھ کو دیکھے جاتی ہے
میں شرما کر کہتا ہوں
"دیکھو! یہ اچھی بات نہیں
اسی طرح کے پاگل پن میں
بیت نہ جائے رات کہیں"

جادُوگر

جب میرا جی چاہے میں جادو کے کھیل دکھا سکتا ہوں
آندھی بن کر چل سکتا ہوں بادل بن کر چھا سکتا ہوں
ہاتھ کے ایک اشارے سے پانی میں آگ لگا سکتا ہوں
راکھ کے ڈھیر سے تازہ رنگوں والے پھول اُگا سکتا ہوں
اتنے اُونچے آسمان کے تارے توڑ کے لا سکتا ہوں

میری عمر تو بس ایسے ہی کھیل دکھاتے گُزری ہے
اپنی سانس کے شعلوں سے گلزار کھلاتے گُزری ہے
جھوٹی سچی باتوں کے بازار سجاتے گزری ہے
پتّھر کی دیواروں کو سنگیت سُناتے گزری ہے
اپنے درد کو دنیا کی نظروں سے چھپاتے گزری ہے

غزل

ہوائے شوق کے رنگیں دیار جلنے لگے
ہوئی جو شام تو جھکڑ عجیب چلنے لگے

نشیبِ در کی مہک راستے سجھانے لگی
فرازِ بام کے مہتاب دل میں ڈھلنے لگے

وہاں رہے تو کسی نے بھی ہنس کے بات نہ کی
چلے وطن سے تو سب یار ہاتھ ملنے لگے

ابھی ہے وقت چلو چل کے اس کو دیکھ آئیں
نہ جانے شمسِ رواں کب لہو اُگلنے لگے

منیر پھول سے چہرے پہ اشک ڈھلکے ہیں
کہ جیسے لعل سُمِ رنگ سے پگھلنے لگے

ایک پُرانی رِیت

جو بھی گھر سے جاتا ہے
یہ کہہ کر ہی جاتا ہے
"دیکھو، مجھ کو بھول نہ جانا
میں پھر لوٹ کے آؤں گا
دل کو اچھے لگنے والے
لاکھوں تحفے لاؤں گا
نئے نئے لوگوں کی باتیں
آ کر تمہیں سُناؤں گا"
لیکن آنکھیں تھک جاتی ہیں
وہ واپس نہیں آتا ہے
لوگ بہت ہیں اور وہ اکیلا
ان میں گم ہو جاتا ہے

ایک آسیبی رات

کافی دیر گزرنے پر بھی جب وہ گھر نہیں آئی
اور باہر کے آسمان پہ کالا بادل کڑکا
تو میرا دل ایک نرالے اندیشے سے دھڑکا

لالٹین کو ہاتھ میں لے کر جب میں باہر نکلا
دروازے کے پاس ہی اک آسیب نے مجھ کو ٹوکا
آندھی اور طوفان نے آگے بڑھ کر رستہ روکا

تیز ہوا نے رو کے کہا "تم کہاں چلے ہو بھائی
یہ تو ایسی رات ہے جس میں زہر کی موج چھپی ہے
جی کو ڈرانے والی آوازوں کی فوج چھپی ہے"

میں نے پاگل پن کی دھن میں مڑ کر بھی نہیں دیکھا
دل نے تو دیکھے ہیں ایسے لاکھوں کٹھن زمانے
وہ کیسے ان بھوتوں کی باتوں کو سچا جانے

جونہی اچانک میری نظر کے سامنے بجلی چمکی
میں نے جیسے خواب میں دیکھا اک خونیں نظارا
جس نے میرے دل میں گہرے درد کا بھالا مارا
خون میں لت پت پڑی ہوئی تھی اک ننگی مہ پارا

پھر گھایل چیخوں نے مل کر دہشت سی پھیلائی
رات کے عفریتوں کا لشکر مجھے ڈرانے آیا
دیکھ نہ سکنے والی شکلوں نے جی کو دہلایا

ہیبت ناک چڑیلوں نے ہنس ہنس کر تیر چلائے
سائیں سائیں کرتی ہوا نے خوف کے محل بنائے

سارے تن کا زور لگا کر میں نے اسے بلایا
"لیلٰے لیلٰے کہاں ہو تم"؟ اب جلدی گھر

"لیلٰے۔ لیلٰے۔ کہاں ہو تم"
لیلٰے۔ لیلٰے۔ کہاں ہو تم
عفریتوں نے مری صدا کو اسی طرح دہرایا

اپنے گھر میں

منہ دھو کر جب اس نے مڑ کر میری جانب دیکھا
مجھ کو یہ محسوس ہوا جیسے کوئی بجلی چمکی ہے
یا جنگل کے اندھیرے میں جادو کی انگوٹھی دمکی ہے

صابن کی بھینی خوشبو سے مہک گیا دالان
اُف اُن بھیگی بھیگی آنکھوں میں، دل کے ارمان
موتیوں جیسے دانتوں میں وہ گہری سُرخ زبان
دیکھ کے گال پہ ناخن کا مدھم سا لال نشان
کوئی بھی ہوتا میری جگہ پہ، ہو جاتا حیران

غزل

رات فلک پر رنگ برنگی آگ کے گولے چھُوٹے
پھر بارش وہ زور سے برسی مہک اُٹھے گل بُوٹے

اس کی آنکھ کے جادو کی ہر ایک کہانی سچّی
میرے دل کے خُوں ہونے کے سب افسانے جھُوٹے

پہلے پہل تو جی نہ لگا پردیس کے ان لوگوں میں
رفتہ رفتہ اپنے ہی گھر سے سارے ناطے ٹوٹے

یہ تو سچ ہے سب نے مِل کر دلجوئی بھی کی تھی
اپنی رسوائی کے مزے بھی سب یاروں نے لُوٹے

میں جو منیرؔ اک کمرے کی کھڑکی کے پاس سے گزرا
اس کی چھت کی تیلیوں سے ریشم کے شگوفے پھُوٹے

ایک پہیلی

آنکھوں میں اندھیری رین بھی ہے
میری ہی طرح بے چین بھی ہے
پر اس کی اپنی شان بھی ہے
ہونٹوں پہ عجب مسکان بھی ہے
اور منہ میں رنگیلا پان بھی ہے.
جب دیکھیں تو شرماتی ہے
جب چاہیں تو گھبراتی ہے

مَیں اور وہ

روزِ ازل سے وہ بھی مجھ تک آنے کی کوشش میں ہے
روزِ ازل سے میں بھی اس سے ملنے کی کوشش میں ہوں
لیکن میں اور وہ ـــــ ہم دونوں
اپنی اپنی شکلوں جیسے لاکھوں گورکھ دھندوں میں
چُپ چُپ اور حیران کھڑے ہیں
کون ہے "مَیں"
اور کون ہے "تو"
بس اسی درد میں کھوئے ہوئے ہیں
صبح کو ملنے والے سمجھیں
جیسے یہ تو روتے ہوئے ہیں

بچّوں جیسی باتیں

آج کا کام نہ کل پر ٹالو
جو کچھ لکھنا ہے لِکھ ڈالو
اِدھر اُدھر کی جھُوٹی باتیں
ذرا ذرا سی جیتیں ماتیں
جانے پھر کب موت آ جائے
دل کی دل ہی میں رہ جائے

قطعہ

شہ نشینوں پہ جھکے ہیں رنگ میں بھیگے سحاب

بہہ رہی ہے گو مگو ان تیز آنکھوں کی شراب

اِک نسائی سانس کی خوشبوؤں میں لپٹا ہُوا

کتنا پر اسرار لگتا ہے یہ ماہِ نیم تاب

قطعہ

کچھ عیشِ رائیگاں کی بھی جادوگری ہوئی
کچھ یادِ رفتگاں سے طبیعت ڈری ہوئی
بیٹھے ہوئے ہیں شہرِ نگاراں کے روبرو
چلتی ہے بادِ شام غموں سے بھری ہوئی

گیت

تم جلتی رہو ــــ تم جلتی رہو

ساون کی اندھیری راتوں میں

بادل سے بھری برساتوں میں

چُپ رہ کر دُکھ کی پیڑ سہو

تم جلتی رہو

جب پشپ لتا کا شور بڑھے

اور کاموناؤں کا زور بڑھے

تب کومل، کانپتے ہردے سے

تم مدُھر مِلن کے گیت کہو

تم جلتی رہو

پھر پریتم پیارا آئے گا

ہر دُکھ پل میں مٹ جائے گا

اُس سمے کے دھیان میں مست رہو

تم جلتی رہو

تینوں جگہ "اور" ہوتا تو کیا بات ہوتی!!

گیت

کِس کِس سے ہم پریت نبھائیں
کون سی مورت من میں بٹھائیں
سانجھ سویرے کس کو ڈھونڈنے
کُنج گلیوں میں جائیں
کس سے پریت نبھائیں

نِت نئی اک سُندر ناری
ہردے بیچ سمائے
جس ناری کو میں چاہوں
وہ دُور کھڑی شرمائے
ایسے بھید سمجھ نہ آئیں

لو پھر سانجھ سہانی آئی
دھیان میں لاکھوں باتیں لائی
سُونے گھر میں سندریوں نے
نینن جوت جلائی!
کس رادھا سنگ راس رچائیں

گیت

رادھا کے کومل ہردے میں کرے کامنا زور
اُس کے سُندر دھیان میں گونجے کوئلیا کا شور
رادھا کے چنچل نینوں میں چھائی گھٹا گھنگھور

آتے جاتے جھونکے اس کو دُکھ کے راگ سنائیں
بندرابن کی چنچل ناریں ہنس ہنس جی کو جلائیں
سوتن کے سنگ راس رچائے نِرموہی چیت چور

دن ڈھلتے ہی ہر آنگن میں
سُکھ کا جادو چھائے
جس کے درس کو رادھا ترسے
وہ موہن کب آئے

بول رے من کے مور

گیت

لو پھر سانولی رجنی نے تاروں بھرا آنچل لہرایا

بیتے ہوئے سب سمے سہانے

گاتے ہوئے اب گیر   رانے

آ گئے دل کا درد بڑھا۔

دھیرے دھیرے سونے نگر پر پھیلی دُکھ کی چھایا

رُوپ نگر کے رہنے والو

جھُوٹے سپنوں کے متوالو

آنکھوں کو کاجل سے سنوارو

پھُولوں کو بالوں سے سجالو

بھور ہُوئی تو مٹ جائے گی سندر رات کی مایا

گئے سمے کا سوگ منائیں

چندرماں کی جوت جلائیں

سُندرتا کی دُھوم مچائیں

ایسی ہی کتنی سوچوں سے جیون کا پنچھی گھبرایا

گیت

بات تو دیکھو پاگل من کی
چاہ کرے اُس کے جوبن کی
جس کا بسیرا اونچ گگن کی
باتیں دیکھو پاگل من کی

جب دن کا دیپک بجھ جائے
اُمڈ گھمڈ کر بادل چھائے
اک ناری شرماتی آئے
آئیں گھڑیاں مدھر ملن کی

سپنے کب سچے ہوتے ہیں
پریمی تو یونہی روتے ہیں
جلتی رہے گی جوت لگن کی

گیت

رات اندھیری، بادل برسے
جیا را دھڑکے موہن ڈر سے
وہ دیکھو! اک سُندر ناری
پیا مِلن کو نکلی گھر سے
جھُوم جھوم کر بادل برسے

پریم نگر کے لوگو! آؤ!!
اس ناری کی دھیر بندھاؤ
ہر سُو نے اندھیارے پتھ پر
مِلن گیت کے دیپ جلاؤ
گوری آئی روپ نگر سے

دیکھو رے اک سُندر ناری
پیا ملن کو نکلی گھر سے
جھُوم جھُوم کر بادل برسے

گیت

من مورکھ کی ایک نہ مانو
اس کے موہ کو جھوٹا جانو
اس کا کام ہے دھوکا کھانا

بنجاروں سے من نہ لگانا

بستی بستی گھومنے والے
رس کے لوبھی، یہ متوالے
نربل سندریوں کے من میں
چاہ کی آگ لگانے والے

ان کی باتوں میں مت آنا

پل بھر کی پہچان ہے ان کی
دو گھڑیوں کا میل
آن کی آن میں مٹ جاتا ہے
ان کی پیت کا کھیل

یہ کیا جانیں لاج نبھانا

گیت

ڈوب گیا اب شام کا سورج آئی کالی رات
اب تو دل میں درد بسے گا نینوں میں برسات
آئی کالی رات

پی درشن کو سج کر نکلی ہر البیلی نار
دور دیس کی رادھا جائے کس موہن کے دوار
کیسے بنے گی بات

ندی کنارے گانے والو، سونے دوار بساؤ
بچھڑ گئے جو میت پرانے رو رو انھیں بلاؤ
ہوئی پریت کی مات

سرِ کہسار

اگر کوہ شوالک سے اس بیدردی کے ساتھ جنگل نہ کاٹے جاتے تو پہاڑوں سے امڈتا ہوا سیلاب ہوشیار پور کی سرزمین کو یوں اپنی لپیٹ میں نہ لے سکتا، آبادی اس طرح ٹکڑیوں میں تقسیم نہ ہوتی اور اگر ہوتی تو ان کے درمیان رسل ورسائل کی آسانیاں تو برقرار رہتیں۔

ہوشیار پور اور اس گاؤں کے درمیان "چو" کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ برسات کے دنوں میں پہاڑی ندی نالے اسے لبالب بھر دیتے ہیں اور جب پانی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو ریت کا لق و دق صحرا شہر اور گاؤں کے درمیان انگڑائی کی طرح پھیلنے لگتا ہے۔ اندھیری راتوں میں چور ان ریگزاروں میں ستا کر اپنے کام پر نکلتے ہیں۔ قبرستان کے ارد گرد کبڑی کھجوروں کے جھنڈ میں مدھم سرگوشیاں ہوتی ہیں، کالی سیاہ ڈراؤنی راتوں میں اس ریگ زار کے ذرے ایک دوسرے سے چمٹے صبح کے انتظار میں آنکھیں جھپکا کرتے ہیں اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اندھیری راتوں میں کوئی دیوانہ چاند کی تلاش میں ادھر آنکلتا ہے اور رات بھر سانپوں سے بھرے جنگل کی آوازیں سنتا رہتا ہے، صبح شہر سے گاؤں جانے والا کوئی مسافر اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور ریت کے ذرے پھر سے دھوپ میں چمکنے لگتے ہیں۔

یہ گاؤں، گاؤں بھی نہیں، قصبہ بھی نہیں۔ اسے نو آبادی بھی نہیں کہا جا سکتا اور شہر

کا سیٹیلائٹ ٹاؤن بھی نہیں۔ ایک بستی ہے کہ بستے بستے بڑی دیر تک اور بڑی دور تک بس گئی ہے۔ چھوٹی اینٹوں کی بل کھاتی گلیاں، نیچی چھتوں کے اونچی کرسیوں والے مکان، رنگ برنگ شیشوں والی بند کھڑکیاں اور کھلے دروازوں پر بانس اور سرکنڈوں کی تیلیوں کی چھتیں۔

اس بستی میں پرانے منصب داروں کے گھر تھے، اب ان میں چمگادڑوں اور ابابیلوں کا بسیرا ہے۔ اس نگری میں ان لوگوں کے دو منزلہ مکان ہیں جو تلاش روزگار کے سلسلے میں افریقہ، کویت یا بحرین میں بستے ہیں۔ ان لوگوں کے گھر والے یہاں رہتے ہیں۔ ان کی لڑکیوں کے سنگھار میز اوپر کے کمروں میں ہوتے ہیں۔ ان کے میزوں پر افریقہ، کویت اور بحرین کے تحفے پڑے ہوتے ہیں۔ پھر یہ لڑکیاں افریقہ، کویت یا بحرین چلی جاتی ہیں اور جب لوٹتی ہیں تو ان کی چھوٹی بہنیں جوان ہو چکی ہوتی ہیں۔ جب وہ آتی ہیں تو افریقہ کی آبنوسی رکابیوں میں غیر ملکی شیرینیاں ولایت رومالوں سے ڈھانپ کر ان چھوٹی اینٹ کی گلیوں میں چلتی ہیں جو آگے نکل کے جوگیوں کے مٹھ کی طرف نکل جاتی ہیں۔ یہ مٹھ ویران ہے۔ اس کی کوٹھڑیاں اور کنڈ ڈھ چکے ہیں۔ دھرم شالہ کے بس قد آدم "کھولے" رہ گئے ہیں اور ان کھولوں میں پھونس کی چھت تلے گونگا رہتا ہے۔ جب سرمئی شام اندھیری رات میں تبدیل ہوتی ہے تو بچے اس گلی کے آخری سرے تک جانے سے کتراتے ہیں۔ انھیں کھنڈروں سے نہیں، اس گونگے سے خوف آتا ہے جس کی بے زبانی ان گری پڑی دیواروں میں صدائے بازگشت بن کر ہر وقت گونجتی رہتی ہے۔ ان بچوں نے آج تک یہ بات کسی سے نہیں سنی کہ یہ گونگا کئی صدیوں سے زندہ ہے۔ جب اس کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو وہ ایک دلدوز چیخ مار کر پھونس کی جھونپڑی جلا دیتا ہے، خود اس میں بھسم ہو جاتا ہے اور اگلی صبح اسی خاکستر سے اٹھ کر ایک سو سال زندہ رہنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یہ بات ہر بچے کے ذہن میں آپ سے آپ جنم لیتی ہے، اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس بستی میں ان لوگوں کے گھر ہیں جو بڑے گھروں کے کارندے ہیں۔ کارندوں کی عورتیں بالوں میں پیتل کے کلپ لگا کر اور ماتھے پر پھول چڑیاں بنا کر گھروں میں کام کرنے آتی ہیں، دھاگے کی گولیوں سے کچے رنگ کے سرخ لیبل نکال کر ہونٹوں پر سرخی کی دھڑی جماتی ہیں اور

ادھر اُدھر دیکھ کر بڑے لوگوں کے دیوان خانوں میں گھس جاتی ہیں۔ انھی بچوں نے ان کو دیوان خانوں میں داخل ہوتے اور وہاں سے نکلتے دیکھا ہے۔ یہی بچے رات کو نانی اماں سے چڑیلوں کی کہانیاں سنتے ہیں اور انھیں مکانوں کے ہر چھجے کی اینٹ خون دکھائی دیتی ہے جیسے کچے لیبل کا رنگ-----

کوہ شوالک سے اگر جنگل اس بیدردی سے نہ کاٹے جاتے. تو یہاں بھی گھٹا کا وہی رنگ ہوتا جو شمال کی گھٹاؤں کا ہوتا ہے۔ سرمئی اور دھولے بادل آگے بڑھتے، برف پوش چوٹیوں اور شجر یار ترائیوں سے ٹکراتے اور وادی میں جل تھل ہو جاتا۔ لیکن شوالک تو بے برگ و بار پہاڑ ہے۔ اس کی چوٹیوں پر ٹھنڈک کہاں، یہاں تو خود تبخیر کا عمل جاری ہے۔ اس کے چاروں اور گھمنڈنے والی گھٹائیں اتنی گھری، اس قدر نیلی اور ایسی دلدار ہوتی ہیں کہ جہاں جہاں سے گزرتی ہیں زمین کا وہ حصہ کششِ ثقل سے عاری ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی ذی روح زمین کے اس حصے پر قدم نہیں جما سکتا اور گھٹائیں اسے اچک کر اپنی گود میں اٹھا لیتی ہیں، آموں کے باغوں پر اڑاتی ہیں، تاریک ریگ زار پر جھولا جھلاتی ہیں اور گئے موسموں کی باس سنگھا کر تڑپاتی ہیں۔

یہ منیر نیازی کی بستی تھی جو اس کے ارد گرد گم اور اس کے ذہن کی گہرائیوں میں طلسمی رنگوں میں بھیگے ہوئے گھر بسا کر بستی جاتی تھی۔

اس وقت ہوشیار پور جالندھر کی سرزمین میں مشاعروں کے بڑے چرچے تھے لیکن منیر کو شعر اور شاعروں سے کوئی رغبت نہ تھی۔ اس وقت وہاں ادبی مجلسیں آراستہ ہونے لگی تھیں پر منیر کا ادب سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ وہ اپنے گھرانے کا ایک بگڑا ہوا بچہ تھا جس کی شکایتیں لے لے کر اب لوگ دور دور سے آنے لگے تھے اور گھر کے کچھ افراد تنہائی میں، بڑی ایمانداری سے، یہ بھی سوچنے لگے تھے کہ اگر منیر نہ رہے تو کتنی مصیبتوں سے ایک ہی بار نجات مل جائے۔

تقسیم کے بعد ایک دن خبر ملی کہ منیر نیازی نے منٹگمری سے ایک ہفت روزہ اخبار "سات رنگ" نکال لیا ہے۔ سب نے سر پیٹ لیا۔ افرادِ خانہ نے منیر سے متعلق اپنی سوچ

پر سے تنہائی کی پابندی اٹھا دی اور بڑے بزرگوں کے ساتھ خاندان کے نوجوان بھی اس سچ میں شریک ہو گئے۔ منیر پرچہ نکال رہا تھا اور دونوں ہاتھوں سے بزرگوں کے خون پسینے والا روپیہ برباد کر رہا تھا۔ گھر کے لوگوں نے خاموشی کا حربہ اختیار کر کے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ لوگ بہت تھے اور وہ اکیلا۔ اس سے یہ بازی جیتی نہ جا سکی۔ اس نے ایک چپ، ایک مستقل خاموشی اور الگ تھلگ پڑے رہنے کے ہاتھ یہ بازی گروی رکھ دی اور گھر والوں کے درمیان رہتے ہوئے اپنے تن آسان ذہن کو نیلی اور دلدار گھٹاؤں کے حوالے کر دیا۔

ایک دن صبح ہی صبح کسی نے پرچہ لگایا کہ منیر شاعر بن گیا ہے۔ شاعروں اور ادبی مجلسوں کی دھواں دھار فضا کے درمیان ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ کسی نے تعجب سے کہا کون منیر! اطلاع دینے والے نے جواب دیا۔ جی ہاں منیر نیازی۔ ایک پرانے دھرانے آدمی نے آہستہ سے سر اٹھا کر کہا۔ میرا قیافہ غلط نکلا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک صبح ہم سب کو یہ خبر ملے گی کہ پال گوگیں کی طرح منیر، مصوّر بن گیا ہے اور تاہیتی کے جھونپڑے میں رنگوں سے کھیل رہا ہے۔

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

اس کے بعد منیر نے غزلیں کہیں، نظمیں لکھیں، قطعے کہے اور گیت لکھے، اور پڑھنے والوں نے یہ محسوس کیا کہ ایسی جانی پہچانی باتیں کرنے والا، اجنبی نہیں ہوا کرتا۔ یہ دستک جو کسی نے پہلی مرتبہ ہمارے دل کے دروازے پر دی ہے بڑی خود اعتمادی کی حامل ہے۔ واویلا کرنے اور پکار لے کر زنجیر کھینچنے والا یوں متیقن نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنی آہ و بکا سے دل کے کمسن جذبات کو نالہ و شیون میں مبتلا کر کے چلا جاتا ہے جو پھر اپنی سسکیوں کی تھپکیوں تلے ہمک ہمک کر سو جاتے ہیں۔ لیکن یہ ہلکی سی دستک کس کی ہے؟

یہ ہلکی دستک منیر نیازی کی شاعری کا سب سے بڑا وصف ہے۔ ایک ایک شعر، ایک ایک مصرع اور ایک ایک لفظ آہستہ آہستہ ذہن کے پردے سے ٹکراتا ہے اور اس کی لہروں کی گونج سے قوتِ سامعہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ منیر کی شاعری میں الفاظ کا طلسم، مجھے کچھ یوں لگتا ہے جیسے کسی بند دو منزلہ مکان کے نیچے صحن میں صدیوں سے ایک

نل قطرہ قطرہ پانی ٹپکا رہا ہے اور ان قطروں کے مستقل گرنے سے سل میں چلو بھر گہرائی پیدا ہو گئی ہے جس میں پہلے قطروں کا پانی جمع ہے۔ گرمیوں کی اسی ہوئی تاریک راتوں میں بس ایک قطرے کی ٹپکاہٹ اس ساری منزل کو ہانٹ کیے جاتی ہے۔ لیکن صرف یہ بات بھی نہیں۔ بوند بوند، جمع ہو کر اس پانی نے سارے صحن میں عجب خوش رنگ پھول کھلاتے ہیں،......... سبز غالیچہ پھیلا دیا ہے۔

منیر نیازی کو دراصل افسانہ نگار ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس نے اپنی محبوبیت سے جہاں اوروں کا دل توڑا ہے وہاں ہماری آرزو کا بھی خون کر دیا ہے۔ اگر وہ تابیتی کا مصور بن جاتا تو بھی مجھے اسی قدر دکھ ہوتا جتنا اس کے شاعر بن جانے سے ہوا ہے۔ لیکن ان کی شان محبوبیت کا تقاضا ہے کہ دوسرے دکھ میں مبتلا ہو کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا اقرار کریں اور وہ ایک ہوشیار مجذوب کی طرح اپنے جذب کے لیے قوت مہیا کرتا رہے۔ اسے شاعری اور شاعری میں اپنی پینترا، اس قدر عزیز ہے کہ وہ اس کے لیے اپنی جان، جذب، حتیٰ کہ ہوشیاری تک کی بازی لگا سکتا ہے۔ اپنی اس شاعری کو انفرادی سالمیت عطا کرنے کے لیے اس نے شعوری اور لاشعوری طور پر اتنے گھر گھالے ہیں کہ اب ان کی سنہری سی دھول باقی رہ گئی ہے جو اس کی شاعری کا بیرونی بالا بن کر دمک رہی ہے۔ اس کی شاعری کا اوپرا نوٹ اسی ہالے کی ضوفشانی سے مرتب ہوتا ہے اور اندر کی بات ان یادوں اور وارداتوں کی جھولی میں جنم لیتی ہے جو کوہ شوالک کی بستی میں مجھ پر، آپ پر، ہم سب پر گزری تھیں۔ ہم نے انھیں خود پیدا کردہ غیر ضروری مصروفیتوں کے حوالے کر دیا اور منیر نے انھیں آسائشوں کے عوض اپنے جذب کے لیے محفوظ کر لیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ گونگے کے کھولے سے پہلو بچا کر گزرتے ہوئے اپنے خوف، بدن کے ارتعاش اور جسم کے رونگٹوں کو عنفوان شباب کی جی داری کے حوالے کر دیتا تو آج ہماری فوج کا ایک نڈر افسر ہوتا۔ شاعری بھی کرتا اور اس کی شاعری کی ریجمنٹ کے میس میں دھوم بھی ہوتی۔

منیر کی شاعری میں ایک بڑا کمال اس کی اختصار پسندی ہے۔ اس کے ہم عصریوں مات کھا گئے کہ ان کی اڑانیں بہت وسیع تھیں، اور بعد کی اڑانیں افق کے چکروں میں الجھ کر رہ

جاتی ہیں۔ "مسائیل" کی طرح عمودی نقطۂ عروج پر نہیں پہنچ سکتیں۔ دوسروں نے بیان شروع کیا اور بیان بند کر دیا، سننے والے سر دھنتے رہے۔ منیر نے بات کی اور ختم کر دی! سننے والے سوچنے پر مجبور ہو گئے اور پھر ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف، ذہن کے چلو میں قطرہ قطرہ ہو کر ٹپکنے لگا---- شاعری سے رغبت ہو یا نہ ہو، ذہن کا چلو تو کسی کا بھی خالی نہیں ہوتا!

طالب علمی کے زمانے میں (اور اس کے بعد بھی) ہم والٹر دی لامیر کی ایک نظم "دی لسنرز" پر ہزار جان سے فریفتہ تھے۔ پتا نہیں ابھی اور کب تک ہمیں یہ نظم اپنی سحر کی نیرنگیاں دکھاتی کہ منیر کی "صدا بصحرا" شائع ہو گئی۔ چھ مصرعوں کی اس ظالم نظم نے ہم سے اتنے بڑے شاعر کا کیسا خوبصورت بیان چھین لیا۔ کس سلیقے سے اس کی ابتدا تھی، کس طرح مونولاگ کا حسن نکھار تھا اور کیسے کیسے الفاظ نے آسیب زدہ ماحول کا تاثر بڑھایا تھا۔ ہم اس کے بیان کو سنتے اور سر دھنتے رہے تھے۔ لیکن منیر نے بات کی اور اس کے بعد ایک لمبی چپ اور "تیز ہوا کا شور" کے بول پر ختم کر دی اور پھر یوں محسوس ہوا جیسے بھاری دروازے اور انتظار کرنے والے کے درمیان سے صدیوں کے بے تحاشا جھکڑ گزر گئے اور بھاری دروازے کے پیچھے اگی ہوئی گھاس، غلام گردش پر اگی ہوئی جنگلی بیلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔ پھر بھاری دروازے کے کھلے ہونے کے زمانے اور بند ہونے کے بعد کی مدت میں اتنے جگ بیت گئے کہ آگے اور پیچھے کا زمانہ ایک ہو گیا۔ ان قرنوں میں اس قلعہ نما محل پر کیا بیتی، ایک داستان ہے جسے اپنی زندگی کے ساتھ طول دیتے جائیے۔

منیر کی شاعری میں ڈائنیں، چڑیلیں، خنجر بکف جشنیں، رنگ و بو میں بسی ہوئی دوشیزائیں اور ایک دفعہ جا کر لوٹ نہ آنے والے لوگ کون ہیں، ان کی وضاحت کرنا میرے بس کی بات نہیں---- مجھے تو بس شوالک کے دامن کی ایک بستی کا علم ہے، اس میں بسنے والے کارندوں کی کلپ پوش عورتوں کا پتا ہے، دشت وفا کی ان خوبصورت ہرنیوں کا علم ہے جو ڈولی میں بیٹھتے وقت یوں دھاڑیں مار مار کر روتی تھیں جیسے ان کی کوئی بہت ہی قیمتی شے بستی کے کسی گھر میں رہ گئی ہو اور جس کے ملنے کی کوئی امید باقی نہ ہو۔ نرگسیت اور

محبوبیت کی ماری ہوئی اس شے کا جب ان لڑکیوں سے سامنا ہو گا تو وہ اپنے عروسی لباس میں کالی بھنوراسی آنکھیں بند کر کے یاقوتی ہونٹوں کو ذرا سی جنبش دے کر بس اسی قدر پوچھ سکیں گی، "بے وفا! ہم سے بچھڑ کے کیا تجھے سکھ کا خزانہ مل گیا؟" اور وہ شے اپنی حرماں نصیبی کی داستاں کہنے ان دوستوں کو پکارے گی جو "چو" کے دامن میں ذروں کے روپ میں پڑے ہیں یا جو برکھا کی رت میں باس بن کر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آتے ہیں ---- مجھے یہ بھی یاد ہے کہ علی الصباح ساڑھے تین چار بجے سب اٹھتے تھے۔ دالان اور صحن پراٹھوں کی خوشبو سے بھرے ہوتے۔ جھیوریاں اور ان کی لڑکیاں چولھے کے پاس پکوان پکانے میں مصروف ہوتیں۔ بڑے بزرگ منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے بدل کر حقہ بجانے میں مصروف ہو جاتے۔ بہلیاں دروازے پر آجاتیں تو بیلوں کی گھنٹیوں کا شور گلی میں پھیل جاتا۔ پھر پکوان اجلے اجلے دسترخوانوں میں باندھ کر قافلہ چلتا۔ گلی کی عورتیں اپنے دروازے پر آ کر ایک دوسری کو آوازیں دینے لگتیں کہ بیبیاں جا رہی ہیں۔ سورج نکلنے سے پیشتر "چو" کا ریگ زار عبور کر لیا جاتا۔ ریت میں دور دور تک تربوز کے کھیت پھیلے ہوتے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں بیل اپنی جانی پہچانی راہوں پر چلتے رہتے اور ہوشیار پور کا سٹیشن آجاتا۔ سورج کی پہلی کرن نمایاں ہونے سے پہلے عطر ریشمی ملبوس والی لڑکیاں جور کابیوں پر حنائی رنگ کے رومال ڈال کر عزیزوں، رشتہ داروں کے گھر آیا جایا کرتی تھیں، ریل کے ڈبے میں بیٹھ چکی ہوتیں۔ سورج کی روشنی سٹیشن کے چھجوں پر نمودار ہوتی تو ریل کی سیٹی بجتی ---- لیکن میں تو کہہ رہا تھا کہ ان سب باتوں کی وضاحت کرنا میرے بس کی بات نہیں اور یہاں ان کی طرف کوئی اشارہ کر کے میں ان نظموں کی خونچکاں گرفت کو کمزور کرنا بھی نہیں چاہتا۔ اگر یہ سب باتیں اسی شدت سے نثر میں کہی جا سکتیں تو منیر افسانہ نگاری نہ کرتا بھلا!

لیکن اتنی ساری خوبیوں کے باوجود منیر میں یا اس کی شاعری میں ایک خرابی بھی ہے۔ وہ نہ جمہور کا شاعر ہے نہ عوام کا، نہ قصیدہ گو ہے نہ سرکاری شاعر، نہ مصورِ فطرت ہے نہ شاعرِ انقلاب۔ وہ تو بس شاعر ہے خالی شاعر۔ اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ایسے شاعروں کی بابت ہم نے پرانے قصوں میں کئی باتیں پڑھی تھیں۔ ابتدائی انگریزی افسانوں میں

انھیں تاریک تہ خانوں میں اپنی سانسوں کے چراغ جلاتے دیکھا تھا۔ ادھیراجوں کے راج بھونوں میں کویوں کے ابھیمان کے کتھائیں سنی تھیں۔ منیر انھی شاعروں کا آواگونی روپ ہے جو سنسار کے ایک کونے میں اپنی کلا جگا کر سالوں اور صدیوں کے نیچے نیچے کسی دوسری اور نکل جاتے ہیں۔

آخر میں مجھے منیر کی ذات پر ایک حملہ کرنا ہے، اور وہ یہ کہ اس کی طبیعت میں تعلی اور خود پسندی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اور وہ کسی دوسرے شاعر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ ہر وقت اپنی ہی شاعری کے چرچے کرتا ہے اور اسی کے گن گاتا رہتا ہے۔ لیکن رونا اس بات کا ہے کہ اس کی شاعری اس کی تعلی اور خود پسندی سے بھی دو قدم آگے ہی نظر آتی ہے۔

اشفاق احمد

جنوری ۱۹۵۹ء

اُس سمت چلو تم بھی اے بھٹکے ہوئے لوگو
جس سمت یہ ویراں سی چپ چاپ سڑک جائے
منیر نیازی

سرِورق: سمیرا